

© rasailojaraid

باب سوم

انگریزی دور کے نئے فتنوں کا سد باب
تحریک

رجوع الی القرآن

اور

ترجمہ و تفسیر قرآن کے مختلف مکاتب فکر

- خانوادہ ولی اللہی اور تحریک شہیدین
- عیسائیوں اور ہندوؤں کی جانب سے تبلیغی بیچار
- سرسید احمد خاں مرحوم اور آنجنابی غلام احمد قادیانی
- شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ یونیدی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ
- ڈاکٹر محمد جمالؒ اور ڈاکٹر محمد رفیع الدین
- مولانا ابوالکلام آزاد اور سید ابوالاعلیٰ مودودی
- امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی

امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے بارے میں ہم اپنا یہ تاثر بھی بیان کر چکے ہیں کہ ”دورِ صحابہؓ کے بعد کی پوری اسلامی تاریخ میں اُن کی سی جامعیتِ کبریٰ کی حامل کوئی دوسری شخصیت نظر نہیں آتی اور اس میں ہرگز کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ وہ واقعہٴ دورِ جدید کے فاتح ہیں۔۔۔“ اور ساتھ ہی تجدیدِ دین اور احیائے اسلام کے بلند و بالا مقاصد کے لیے اُن کی ہمہ جہتی مساعی کا ایک اجمالی خاکہ بھی بیان کیا جا چکا ہے اور یہ بھی عرض کیا جا چکا ہے کہ ان مختلف النوع اور وسیع الاطراف مساعی میں ان کی اہم ترین خدمت یہ تھی کہ انہوں نے ”اسلام کا رشتہ اس کی اصل ثابت یعنی قرآن حکیم کے ساتھ از سر نو قائم کرنے کے طویل عمل کا بلا تامل و ہراسانہ اہتمام کیا اور یہ کہ ان کا عظیم ترین کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے توجہات

کو از سر نو قرآن حکیم کے علم و حکمت کی جانب منعطف کر دیا۔ اور اللہ کی رسی کے ساتھ تہمتِ مسلمہ کے تعلق کو دوبارہ استوار کرنے کی سعی کا آغاز کر کے گویا حضرت ابو بکر صدیقؓ کے اس قول کے مطابق کہ ”لا یصلح اخر هذه الامة الا بما صلح به اولها“ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کی سعی و جہد کی راہ کھول دی!“

اس سے پہلے ہم یہ بھی واضح کر چکے تھے کہ صدرِ اول میں اسلام کی عظیم ترین حقیقتیں دو ہی تھیں: ایک ایمان — وہ ظاہری اور قانونی و فقہی ایمان نہیں جس کا تعلق ”اشتراك باللسان“ سے ہے بلکہ وہ حقیقی اور قلبی ایمان جو یقین بن کر انسان کے رگ و پے میں سرایت کر جائے — اور دوسرے جہاد فی سبیل اللہ جس کا مقصد ہو ”شہادت علی الناس“ — ”اعلاء کلمۃ اللہ“ اور اظہارِ دینِ حق علی الدینِ کلمہ — اور چونکہ ایمانِ حقیقی کا منبع و سرچشمہ ہے قرآن حکیم اور جہاد و قتال کی علامت ہے تو ازلہٰذا مردِ مومن کی شخصیت کا جو بیہول و چشم تصور کے سامنے اُبھرتا ہے اُس کے ایک ہاتھ میں بالکل بجا طور پر قرآن ہوتا ہے اور دوسرے میں تلوار!

صحیح ہے کہ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی اپنی زندگی میں سرکفت سیف بہت اور کفن بردوش میدان جہاد و قتال میں نکلنے کا مرحلہ نہیں آیا لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ان کی وفات کے نصف صدی کے اندر اندر جہاد و قتال فی سبیل اللہ کا جو غفلہ سرزمین ہند میں بلند ہوا وہ تمام تر ان ہی کی تجدیدی دعوت کی صدائے بازگشت تھی۔ اس لیے کہ خود حضرت سید احمد بریلویؒ بھی خانوادہ ولی الہی ہی کے تربیت یافتہ تھے اور ان کے دست راست تو تھے ہی شاہ اسماعیلؒ ابن شاہ عبدالغنیؒ ابن شاہ ولی اللہؒ اور اگرچہ انجام کار کے اعتبار سے ہندوستان کی یہ پہلی اسلامی تحریک "شعلہ مستعلی" کا مصداق بن گئی لیکن اس کی خوش درخشیدگی، یقیناً ہر شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ یہاں تک کہ واقعہ یہ ہے کہ اس تحریک جہاد کے داعیوں کے ایمان و یقین ذوق و شوق اور جوش و خروش کے تذکرے سے بے اختیار صحابہ کرامؓ یاد آجاتے ہیں اور سخت حیرت ہوتی ہے کہ "ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی؟ اور یہ ایک تین ثبوت ہے اس کا کہ اگر دعوت کی اساس اور منہج عمل وہی اختیار کیا جاتے جو اسلام کے صدراول میں کیا گیا تھا تو سیرت و کردار کے وہی نمونے آج بھی تیار ہو سکتے ہیں جو در صحابہؓ کا طرہ امتیاز ہیں، گویا بقول جگر مراد آبادیؒ

چمن کے مالی اگر بنالیں موافق اپنا شعار اب بھی
چمن میں آسکتی ہے پلٹ کر چمن سے روٹی بہار اب بھی

ہندوستان میں انگریز کے باقاعدہ عسکری تسلط کا آغاز تو ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی کے نتیجے میں گریشاہ ولی اللہ دہلویؒ کی زندگی ہی میں (ان کی وفات سے چھ سال قبل) ہو گیا تھا تاہم اسے ایک باضابطہ کل ہند سلطنت بننے میں پوری ایک صدی لگی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ء کے غریبا بغاوت کی صورت میں آخری چمکی لے کر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ساڑھے چھ صد سالہ دور ختم ہو گیا۔ اور تاریخ ہند کے برطانوی دور کا آغاز ہو گیا۔

اٹھارویں صدی عیسوی کا نصف آخر اور انیسویں صدی کا نصف اول ہند میں سخت اضطراب و انتشار و آشوب و رنج و سخت کا زمانہ ہے جس میں مسلمان بالخصوص حد درجہ مایوسی اور دل شکستگی کا شکار

رہے۔ بالوہی کے اس غلبے میں جب کہ حالت یہ ہوتی ہے کہ
 آرژو واول تو پسیدہ ہونہیں سکتی کہیں
 اور ہو جائے تو مر جاتی ہے یا رہتی ہے خام

ظاہر ہے کہ تحریک شہیدینؒ ایسی پر عزیمت دعوت کا پینا اور کامیاب ہونا آسان نہ تھا۔ چنانچہ
 یہی ہوا کہ ۱۸۳۱ء میں شہیدینؒ نے ”بجاک و خون غلطیدن“ کی روش اختیار کر لی اور اپنے بہت
 سے رفقاء کے ساتھ جام شہادت نوش کر لیا اور اس طرح بالاکوٹ کی فضاؤں میں دعوتِ ولی اللہی
 کی یہ پہلی صدائے بازگشت دم توڑ گئی۔ اور بعد میں اگرچہ مجاہدین مسلسل
 ”من از سر نو جلوہ دم دار و رسن را“

رعمل برار رہے اور ان کی مساعی کا سلسلہ بالآخر ریشمی رومالوں کی تحریک تک امتد ہوا لیکن ظاہر ہے
 کہ ان کا یہ بھڑکائی براہ نہ ہو سکا۔ اور ہندوستان میں انگریز کا اقتدار اور قبضہ دن بدن مستحکم ہوتا چلا گیا

برطانوی دور میں مسلمان ہندو زندگی اور موت کی جس کشمکش سے مسلسل دوچار رہے اس کے
 متعدد پہلو تھے، خالص دینی و مذہبی بھی، علمی و فکری بھی، سماجی و مجلسی بھی، اور قومی و سیاسی بھی
 — ان میں سے اس وقت ہماری گفتگو خالص دینی و مذہبی کشمکش تک محدود ہے (دومی)
 سیاسی کشمکش کے بارے میں ہم نے ۱۹۶۷ء میں ان ہی صفحات میں تفصیل کے ساتھ اظہار رائے کیا
 تھا۔ یہ مضامین اسلام اور پاکستان کے زیر عنوان کتابی صورت میں شائع کیے جا چکے ہیں) — مزید
 برآں یہ جو کبھی جنگ مسلمانوں کو بیک وقت دو دشمنوں سے لڑنی پڑی، انگریزوں سے بھی اور
 ہندوؤں سے بھی! اور جیسا کہ بالعموم ہوتا ہے اس میں اولاً مسلمانوں کو مدافعت ہی پر اکتفا کرتے تھے
 اور ایک طویل عرصے بعد ہی یہ صورت پیدا ہو سکی کہ قدم جبا کر کسی مثبت اساس پر تعمیرِ جدید کی
 کوشش شروع کر سکیں۔

خالص مذہبی میدان میں مسلمانوں کو سب سے پہلے عیسائی مشنریوں کی یلغار سے سابقہ
 پیش آیا۔ ۱۸۲۶ء میں ہمبر (HABER) لارڈ بشپ آف کلکتہ نے براستہ دہلی بمبئی تک پورے

ہندوستان کا دورہ کرنے کے بعد اعلان کیا کہ ہم نے اچھی طرح دیکھ لیا ہے کہ مسلمان ہندوئیں
 نہ کوئی مذہبی جذبہ باقی رہا ہے نہ سیاسی قوت۔ لہذا عیسائیوں کو کھل کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرنی
 چاہیے۔ چنانچہ عیسائی پادری چاروں طرف سے ٹوٹ پڑے اور نوبت بانجار سید کے جامع مسجد
 دہلی کی سیڑھیوں پر بھی عیسائیت کی تبلیغ ہونے لگی۔ تب وہی سنت الہی ظاہر ہوئی کہ
 خون اسرائیل آجاتا ہے آخر جوش میں

توڑ دیتا ہے کوئی موسےؑ طلسم سامریؑ

اور یہ سعادت اسی خطے کے حصے میں آئی جس میں علم و حکمت ولی الہی کے چشمے بہرہ ہے تھے
 کہ ضلع مظفرنگ کے قصبہ کیرانہ سے مولانا رحمت اللہ نامی شخصیت ابھری جس نے پادری فینسٹر
 کی کتاب میزان الحق کا دندان شکن اور مسکت جواب "انہما الحق" کے نام سے تحریر

کیا۔ نتیجہ پادری صاحب موصوف کو ہندوستان سے دم دبا کر بھاگتے ہی بنی ——— (اور
 پھر جب اس نے اپنی سرگرمیوں کا مرکز ترکی کو بنایا اور وہاں کے علماء کا ناک میں دم کر دیا اور
 وہاں سے طلبی پر مولانا رحمت اللہ کیرانوی ترکی پہنچے تو وہاں سے بھی نو دو گیارہ ہو گیا)۔ مباحثے
 اور مناظرے میں اس شکست فاش کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعد میں ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کھلے
 میدان میں ختم ٹھونک کر کبھی نہ کی جاسکی۔ اور اس کی واحد ممکن صورت صرف یہ رہ گئی کہ پانڈہ طبقہ
 کی تالیف قلب کے ذریعے کچھ لوگوں کے ناموں کے آگے چپکے سے "سیح" کا لالچہ چپاں کر دو اور
 دوسری طرف عیسائی پادریوں کے دیکھا دیکھی ہندوؤں کی باسی کڑھی میں بھی اُبال آگیا

اور مسلمانوں پر ان کا تبلیغی حملہ دو صورتوں میں ہوا: ایکٹ خالص عیسوی اور تنگ نظرانہ انداز میں
 دوسرے قدرے وسیع الشرب کے رنگ اور ترقی پسندانہ انداز میں ——— ان میں سے
 پہلے کا حشر تو اگر عیسائی مشنریوں کے انجام عیسایہ ہی ہوا لیکن جس طرح کوئی بنجار جاتے جاتے
 مرلیض کے لیے کوئی اذیت بخش چیز چھوڑ جاتا ہے جسے عام گھریلو زبان میں "بجڑا" کہتے
 ہیں اسی طرح یہ فتنہ بھی جاتے جاتے جبہ ملت میں ایک سلطان کی بجڑیں جما گیا ——— رہا
 دوسرے انداز کا حملہ تو اس نے مسیحی پھری والا کام کیا اور مسلمانان ہند کے اچھے بھلے حصے کو
 متاثر کیا یہاں تک کہ بعض انتہائی اہم شخصیتیں بھی اس کی زلف گرہ گیر کی اسیر ہو گئیں۔

اول الذکر حملہ — آریہ سماجیوں کی جانب سے تھا جنہوں نے ۱۸۶۵ء ہی کے لگ بھگ مسلمانوں کو لکنا شروع کر دیا تھا اور ۱۸۷۵ء میں سوامی دیانند سرسوتی کی تصنیف ”ستھیارتھ پرکاش“ کی اشاعت سے تو گویا یہ فتنہ عروج کو پہنچ گیا تھا۔ ان کے جواب کے لیے علماء حق بھی میدان میں آئے لیکن بد قسمتی سے اس میدان میں نمایاں حیثیت آنجنہا نے غلام احمد دہلوی کو حاصل ہو گئی جس نے ۱۸۸۳ء میں اپنی تالیف ”سُرتہ چشم آریہ“ ہی کے ذریعے وہ ہر دلعزیزی حاصل کی تھی جو اس کے ظرف سے بہت زیادہ ہونے کے باعث چھلک پڑی۔ نتیجہً وہ خود بھی گمراہ ہوا اور دوسرے سینکڑوں اور ہزاروں کو بھی گمراہ کر گیا۔

نوفر الذکر حملہ — برہم سماج کی صورت میں سامنے آیا جس کی تاسیس ۱۸۱۶ء میں راجہ رام موہن رائے (ولادت ۱۷۷۰ء، وفات ۱۸۳۳ء) نے کی تھی عجیب بات ہے کہ انتہائی ذہین فطرتی اور عالم و فاضل شخص بھی پہلے اسلام اور مسلمانوں کی جانب سے مدافعت کرتے ہوئے ہی سامنے آیا۔ چنانچہ اس نے مسلمانوں کو عیسائی مشنریوں کے حملے سے بچانے کے لیے ”تحفۃ الموحدین“ تصنیف کی اور اس طرح مسلمانوں میں ہر دلعزیزی حاصل کر لی۔ بعد میں شیخ اشرف علی تھانویؒ کا چارک، ہندوستان کی عظمت و سطوتِ پارینہ کا نقیب اور ہندوئی شینکرم کا علمبردار بن کر سامنے آیا۔ اور مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نرم گوشہ پیدا کرنے کے لیے اس نے اکبر اعظم علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ”دین الہی“ کے چربے کے طور پر وحدتِ ادیان کا فلسفہ ایجاد کیا۔ جس کے ناوک نے اچھے اچھوں کو زخمی کیا اور بڑے بڑوں کے دلوں کو چھید ڈالا۔ واقعہ یہ ہے کہ ائمہٴ کرام و مشنل کانگریس کی پوری تحریک اسی ایک شخص کے ظل اور بروز کی حیثیت رکھتی ہے اور گاندھی جی کی شخصیت پر سب سے گہری چھاپ اسی کی نظر آتی ہے عجیب مماثلت ہے کہ جس طرح راجہ جی نے اسلام اور مسلمانوں کی مدافعت میں ”تحفۃ الموحدین“ تالیف کی اسی طرح گاندھی جی نے مسلمانوں کی تالیفِ قلب کے لیے تحریکِ خلافت میں شمولیت اختیار کی اور وحدتِ ادیان کے فلسفے کو اتنا اچھا لاکر مولانا ابوالکلام آزادؒ و موصیٰ عظیم اور نابغہٴ شخصیت بھی اس کی زلفِ گیر کی اسیر ہو گئی۔ ”ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں“

مسلمانانِ ہند کی مثبت احمیائی مساعی کا آغاز دراصل میسویں صدی عیسوی کی ابتداء سے ہوا۔

یہ مساعی قومی و ملی سطح پر اور خالص سیاسی میدان میں بھی ہوئیں اور علمی و فکری سطح پر بھی۔ ہم مختلف مواقع پر اس احمیائی عمل کے مختلف پہلوؤں پر اظہار رائے کر چکے ہیں۔ آج ہمیں اس جہت ہی عمل کے اس پہلو پر روشنی ڈالنی ہے جو ہمارے نزدیک خالص تجدید و احیائے دین اور ٹھیکہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے اعتبار سے اہم ترین ہے۔ اور وہ یہ کہ بحمد اللہ نکاہوں کا ارتکاز رفتہ رفتہ قرآن مجید پر ہوتا جا رہا ہے اور اُمتِ مسلمہ جو کلام اللہ سے بالکل بیگانہ ہو گئی تھی دوبارہ اس کی طرف متوجہ ہو رہی ہے اس عمل کا آغاز جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے، اٹھارویں صدی میں شاہ ولی اللہ دہلوی نے قرآن مجید کے فارسی ترجمے اور الفوز الکبیر فی اصول التفسیر کی تالیف سے کیا۔ انیسویں صدی کے آغاز میں اُن کے دو صاحبزادوں، شاہ رفیع الدین، اور شاہ عبدالقادر کے علی الترتیب لفظی و باحاورہ اردو ترجمے شائع ہوئے (شاہ رفیع الدین ۱۸۰۵ء میں اور شاہ عبدالقادر ۱۸۱۰ء میں)۔ انیسویں صدی کا اکثر حصہ اگرچہ سیاسی شکست و ریخت اور عیسائیوں اور اریہ سماجیوں کے ساتھ مباحثوں اور مناظروں میں بیت گیا تاہم اس کے اواخر ہی میں ”رجوع الی القرآن“ کا وہ عمل پھر شروع ہو گیا تھا جو بیسویں صدی کے اوائل میں پوری شدت کو پہنچا۔

”رجوع الی القرآن“ کے اس عمل کا جائزہ لیتے ہوئے یہ امر پیش نظر رہنا ضروری ہے کہ آغازِ کار میں اس میں اُن گروہوں نے بھی حصہ لیا جو بعد میں انتہائی غلط راہوں پر چل نکلے اور ضلّوا و اَضَلُّوا کا مصداق کامل بن گئے۔ ان میں وہ بھی ہیں جو ”ضَلُّوا و اَضَلُّوا لَمْ یُعِیدُوا“ کی اُس حد کو پہنچ گئے کہ اُمت کو مجبوراً ان کا تعلق اپنے سے منقطع کرنا پڑا جیسے قادیانی، اور وہ بھی ہیں جن کی یا تو گمراہی اس درجے کی نہ تھی یا اہمیت اتنی نہ تھی کہ یہ انتہائی قدم اٹھایا جاتا جیسے جکڑالوی و پرویزی۔ تاہم چونکہ انہوں نے بھی قرآن حکیم کی جانب ارتکاز توجہ کے عمل میں صحیح یا غلط طور پر کچھ حصہ لیا ہے لہذا ان کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اسے کسی بھی درجے میں ان کی تائید کے مترادف نہ سمجھا جائے۔

سب سے پہلے تو اندازہ کرنا چاہیے کہ گزشتہ صدی کے ربعِ آخر اور موجودہ صدی کے ربعِ اول میں ترجمہ و تفسیرِ قرآن کے ذیل میں برصغیر پاک و ہند میں کس قدر کام ہوا:

(۱) سب سے پہلے سرسید احمد خاں مرحوم نے ۱۸۷۵ء میں اپنے ہفت روزہ اخبار 'تہذیب الاخلاق' میں تفسیر قرآن کا سلسلہ شروع کیا جو گیارہ سال میں پندرہ پاروں تک پہنچ کر رک گیا۔

(۲) ۱۹۰۳ء میں ڈپٹی نذیر احمد صاحب کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۳) ۱۹۰۶ء میں مرزا حسرت دہلوی کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۴) ۱۹۱۰ء میں مولوی فتح محمد جالندھری کا ترجمہ شائع ہوا۔

(۵) ۱۹۰۵ء میں مولوی عبداللہ چکوالوی کی تفسیر شائع ہوئی۔

(۶) ۱۹۱۱ء میں مرزا ابوالفضل ایرانی (شیعہ) نے انگریزی میں ترجمہ شائع کیا۔ اس کو دیکھ کر نواب عماد الملک بگرامی نے اس سے بہتر ترجمہ شروع کیا۔ لیکن سولہ پاروں تک ہی پہنچ پائے تھے کہ فوت ہو گئے۔ لہذا یہ نامکمل رہ گیا اور شائع نہ ہو سکا۔

(۷) ۱۹۰۶ء میں مولانا اشرف علی تھانویؒ نے تفسیر بیان القرآن لکھنی شروع کی جو ۱۹۱۵ء میں مکمل ہوئی۔

(۸) ۱۹۲۰ء کے لگ بھگ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کا ترجمہ مع مختصر حواشی شائع ہوا۔ حواشی سورۃ نساء تک حضرت شیخ الہندؒ کے ہیں اور باقی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے۔

(۹) ۱۹۱۷ء میں محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمہ قرآن مع مختصر حواشی شائع ہوا۔ اسے اس قدر شہرت حاصل ہوئی کہ ۱۹۲۰ء تک کل تین برس میں اس کے تیس ہزار نسخے فروخت ہو گئے۔

(۱۰) ۱۹۲۲ء میں محمد علی لاہوری ہی کی اردو تفسیر شائع ہوئی، اس کا نام بھی 'بیان القرآن' ہی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہرست کسی طرح بھی مکمل نہیں کہلا سکتی، تاہم اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید کے ساتھ اعتناء و التفات کا ایک سلسلہ گزشتہ صدی کے اواخر سے شروع ہو گیا تھا اور اس صدی کے ربع اول کے ختم ہونے تک خاصی دلچسپی مسلمانان ہند کو قرآن حکیم اور اس کے علوم و معارف کے ساتھ پیدا ہو چکی تھی۔

ہم اس سے قبل ایک موقع پر قدرے تفصیل کے ساتھ بیان کر چکے ہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں ملت اسلامی کی نشاۃ ثانیہ کے عمل کے دوران دو متضاد نقطہ نظر اور طرزِ رائے فکر پُران پڑھتے گئے۔ ایک وہ جس کا منبع و سرچشمہ علی گڑھ بنا اور دوسرے وہ جس کے مرکز و محور کی حیثیت دیوبند کو حاصل ہوئی۔ ابتداء میں راسخ العقیدہ علماء کی گرفتِ مسلم معاشرے پر اتنی مضبوط تھی کہ علی گڑھی طرزِ فکر کو اپنے لیے راستہ بنانے میں شدید مخالفت و مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے تحت اُس کے اثرات وسیع سے وسیع تر ہوتے چلے گئے اور علماء کا حلقہ اثر کھڑا چلا گیا تاہم اب بھی ہمارے جسدِ ملی کے بحرِ محیط میں یہ دونوں رَویں بالکل مَرَجِ الْبَحْرَيْنِ یَلْتَقِیْنَ ہِیْنِیْضًا بَیْضًا کی سی شان کے ساتھ بہہ رہی ہیں۔ اور اگرچہ قومی و سیاسی میدان میں علی گڑھی محکمہ فکر کو فیصلہ کن فتح حاصل ہوئی تاہم مذہبی میدان میں اب بھی غلبہٴ اقتدار راسخ العقیدہ علماء ہی کو حاصل ہے۔

اس تفرق و اختلاف کے جو اثرات ہماری قومی و سیاسی جدوجہد پر مرتب ہوئے وہ ہماری اس وقت کی گفتگو کے موضوع سے خارج ہیں۔ اس وقت صرف یہ عرض کرنا ہے کہ قرآن حکیم کی جانب توجہ و التفات کا جو رجحان پیدا ہوا اُس میں بھی یہ دونوں رنگ بالکل علیحدہ علیحدہ نظر آتے ہیں۔ چنانچہ متذکرہ بالا تراجم و تفاسیر کو بنیادی طور پر دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ ایک متجدد و نازک کی حامل تفاسیر جن کے ضمن میں سرسید احمد خاں مرحوم کی تفسیر کو اصل الاصول کی حیثیت حاصل ہے اور دوسری روایتی انداز کی راسخ العقیدہ تفاسیر جن میں حضرت شیخ الحداد کا ترجمہ اور مولانا تھانویؒ کی تفسیر بنیادی اور اساسی اہمیت کی حامل ہیں۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے تراجم و تفاسیر یا بالفاظِ دیگر ”فکر قرآنی“ کے میدان میں خواہ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کی چکڑا لوتیت ہو خواہ محمد علی لاہوری کی لاہوریت، اور خواہ علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی کی مشرقیت ہو خواہ چودھری غلام احمد پر دیز کی پرویزیت، یہ سب فکر سرسید ہی کی شاخیں ہیں اور دوسری طرف مولانا تھانویؒ کی ”بیان القرآن“ پر مبنی تین مزید تفسیریں منصفہ شہود پر آچکی ہیں۔ ایک مولانا عبد الماجد دریابادی کی تفسیر جس میں تقابلِ ادیان اور خصوصاً بائبل ہسٹری کے ضمن میں بہت مفید مباحث ہیں دوسری مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی تفسیر جس میں کلامی مسائل پر زیادہ

توجہ کی گئی ہے اور تیسری مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تفسیر جس میں فقہی مسائل سے زیادہ اعتناء کیا گیا ہے جہاں تک مقدم الذکر مکاتب فکر کا تعلق ہے، ہمیں ان سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں ہے اور ہم انہیں ضلالت و گمراہی ہی کے مختلف رنگ (SHADES) سمجھتے ہیں۔ بایں ہمہ اس جائزے میں اُن کا ذکر دو وجوہ سے کیا گیا ہے: ایک یہ کہ اُن کی مساعی سے بھی اُمت کے بعض عناصر میں قرآن مجید سے ایک دلچسپی پیدا ہوئی۔ اور اگرچہ اُن کے زیر اثر یہ دلچسپی غلط رخ پر پڑ گئی، تاہم اس امکان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ اگر قرآن حکیم کے حقیقی اور اصلی علوم و معارف پیش کیے جائیں تو ان مکاتب فکر سے منسلک لوگوں کو باسانی راغب کیا جاسکتا ہے۔ اور دوسرے یہ کہ ان مکاتب فکر نے گویا ایک 'دعویٰ' (THESIS) کی شکل اختیار کر لی جس کے جواب 'دعویٰ' (ANTI-THESIS) کے طور پر اسخ العقیدہ علماء کو ترجمہ و تفسیر قرآن کی جانب متوجہ ہونا پڑا اور اس طرح ایک بڑا عظیم و عظیم الشان تصادم برپا ہو گیا۔ جس سے قرآن مجید کی جانب عوام کی توجہات کے انعطاف کا عمل تیز تر ہو گیا۔

ویسے یہ عرض کرنا غالباً خارج از محل شمار نہیں ہوگا کہ خود علماء کے حلقوں میں تا حال قرآن حکیم پر توجہ اس درجہ مرکوز نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہئیے تھی۔ راقم الحروف نے ایک بار مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ سے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ اصول حدیث اور اصول فقہ پر تو ہمارے یہاں ضخیم تصانیف موجود ہیں لیکن اصول تفسیر پر کل دو مختصر رسالے ملتے ہیں ایک امام ابن تیمیہؒ کا اور دوسرا شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا ہے۔ اس کا جواب تو مولانا نے قدرے توقف کے بعد یہ دیا کہ اصل میں اصول فقہ کی کتابوں میں اصول تفسیر بھی زیر بحث آ جاتے ہیں لہذا علیحدہ تصانیف کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ لیکن جب میں نے دریافت کیا کہ اس کا کیا سبب ہے کہ آپ کے دارالعلوم میں تخصص فی الحدیث کا شعبہ بھی ہے اور تخصص فی الفقہ کا بھی لیکن تخصص فی التفسیر کا شعبہ موجود نہیں ہے؟ تو اس پر مولانا نے پوری فراخ دلی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ باری کوتاہی ہے! اسی طرح حیرت ہوتی ہے کہ حلقہ دیوبند کے علماء کرام کے دلوں میں حضرت شیخ الحدیث کا جو مقام و مرتبہ ہونا چاہیے اور فی الواقع ہے وہ اظہر من الشمس ہے لیکن اُن کی آخری نصیحتوں میں سے اہم ترین نصیحت جسے نقل فرمایا مفتی محمد شفیعؒ نے، اس پر عمل کہیں نظر نہیں آتا۔ اَلَا نَسْأَلُ اللہ

بہر حال علی گڑھ اور دیوبند کی ان دو انتہاؤں کے مابین ملت اسلامیہ مہند کے محیط میں
'فکر قرآنی' کے تین سوتے اور چھوٹے جنہیں مجموعی طور پر (SYNTHESIS) سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔
(۱) ایک وہ جس کا منبع اور سرچشمہ بنے علامہ اقبال مرحوم جو معروف و متداول معنوں میں تو
نہ مترجم قرآن تھے نہ مفسر قرآن۔ بلکہ اُن کی تعلیم بھی نہ کسی دارالعلوم میں ہوئی تھی، نہ جامعہ اسلامیہ
میں۔ اس کے برعکس وہ سکولوں اور کالجوں کے تعلیم یافتہ اور یورپی یونیورسٹیوں کے فیض یافتہ تھے۔
ہاں ہر قرآن حکیم کی ترجمانی کے اعتبار سے اُن کا مقام یقیناً 'رومی ثانی' کا ہے۔ یہاں تک کہ
انہوں نے پورے اعتماد کے ساتھ مناجات مجبور تہا لکھیں جس میں یہ تک کہہ دیا کہ:

گردم آئینہ بے جوہر است در بحر فم غیر قرآن مضمراست
روزہ اتوی منکم چاک کُن ایں خیاباں رازِ غارم پاک کُن
روزِ محشر خوار و مسوا کُن مرا بے نصیب از بوتہ پاک کُن مرا

چنانچہ اُن کے اشعار تو ایمان و یقین کے کیف و سرور، محبتِ الہی اور عشقِ رسولؐ
کے سوز و گداز اور جذبہ و جوشِ ملی سے مملو ہیں ہی، اُن کے خطبات، بھی درحقیقت وقت کی اعلیٰ ترین
فکری سطح پر مطالعہ قرآن حکیم ہی کی ایک کوشش کا مظہر ہیں جس کے ذریعے علامہ مرحوم نے
جدید ریاضیات و طبیعیات اور فلسفہ و نفسیات کا رشتہ قرآن حکیم کی اساسی تعلیمات کے ساتھ
جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ اس کے بغیر دورِ حاضر میں دین و مذہب کی گڑھی
کا آگے چلنا محالِ مطلق ہے۔

علامہ مرحوم کی اس فکری کاوش کے ضمن میں اُن کے معروف ہم نشینوں نے تو کوئی مزید
کام نہیں کیا۔ البتہ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے اس سلسلے میں خاصی وسیع خدمات سر انجام
دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف قرآن اور علمِ جدید' نامی تالیف کے ذریعے بعض جدید ادراہم
نظریوں اور فلسفوں جیسے ڈارون کا نظریہ ارتقاء، فراڈ کا نظریہ جنس، مارکس کا نظریہ جدلیات و
وغیرہ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیا اور ان کے صحیح اور غلط اجزاء کی نشاندہی کی کوشش کی
اور دوسری طرف "IDEOLOGY OF THE FUTURE" نامی تصنیف کے ذریعے علامہ مرحوم
کے فلسفہ خودی کو ایک مرتب اور منظم نظامِ فکر کی حیثیت سے واضح کیا اور ثابت کیا کہ نوعِ انسانی

اس پر جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ اپنے پیشرو کی طرح جو ایک وقتی سی رکاوٹ سے بدل ہو کر کاٹا ہی بدل گیا تھا، مولانا مودودی بھی قیام پاکستان کے وقت کچھ فوری سی توقعات اور وقتی سے امکانات سے دھوکہ کھا کر پاکستانی سیاست کے گرداب میں کود پڑے۔ اور پورے تیس برس ہونے کو آئے کہ وہ پوری جماعت سمیت اسی صحرائے تیہہ میں سرگرداں ہیں (اور اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ چالیس سال پورے کر کے بھی انہیں یا ان کی جماعت کو اس صحرا نوردی سے نجات ملے گی یا نہیں؟) — اور اس پر بھی جتنا افسوس کیا جائے کم ہے کہ عمر کے آخری مرحلے میں خلافت اور ملکیت، نامی تالیف کے ذریعے مولانا مودودی رفض اور تشیع کی تقویت کا حجب بن گئے، تاہم ان کی خدمات بالکل رائیگاں جانے والی نہیں ہیں۔ انہوں نے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں کے دلوں میں اسلام کے غلبے کی آرزو پیدا کی ہے اور ہزاروں کو اس جدوجہد میں عملاً مبتلا کیا ہے اور اگرچہ ایک غلط فیصلے اور اس پر بیجا اصرار نے ان کی چالیس سالہ مساعی کو غلط رخ پر ڈال کر رکھ دیا ہے تاہم قرآن کی انقلابی دعوت کا جو صورت انہوں نے چھونکا ہے وہ یقیناً بہت سے دلوں کو گرماتا رہے گا اور کیا عجب کہ ابوالکلام آزاد مرحوم ثم ابوالاعلیٰ مودودی کی دیرین جہاد پھر کسی گوشے سے نئی آب و تاب اور تازہ جوش و خروش کے ساتھ ابھرے۔ وَمَا ذَلِكْ عَلٰی اللّٰهِ بَعِزِّیْن!

(۳) وہ عظیم شخصیت جس سے برصغیر میں دیوبند اور علی گڑھ کے مابین قرآنی فکر کا تیسرا ستون چھوٹا، مولانا حمید الدین فراہی کی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ قدیم اور جدید کا حسین ترین امتزاج ان ہی ذات میں ملتا ہے۔ انہوں نے بیس سال ہی کی عمر میں اُس دور کے چوٹی کے علمائے فارسی، عربی اور دینی علوم کی تحصیل مکمل کر لی تھی۔ اس کے بعد وہ علی گڑھ کے ماحول میں رہے اور وہاں انہوں نے انگریزی زبان اور فکر جدید کا مطالعہ براہِ راست کیا۔ اور پھر ان کی نگاہیں قرآن حکیم پر مرکوز ہو گئیں۔ اور انہوں نے باقی پوری زندگی 'حکمت قرآنی' کی گہرائیوں میں غوطے لگانے

لے چنانچہ اہم فراہی کی وفات پر جو تعزیتی مضمون مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اپنا مرعارف نامہ

۲۰۱ جلد ۲۷ بابت جنوری و فروری ۱۹۳۱ء میں مولانا فراہیؒ کے اس شعر کو عنوان بنا کر لکھا تھا کہ

فغانِ کرگشتِ نیرشدہ سخن خاموش و گر چکوہِ تسلیٰ کم سن این لب و گوش

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

میں بسر کر دی۔ اور اگرچہ اُن کا مزاج "کاتا اور لے دوڑی" کے بالکل برعکس "نیکی کر دریا میں ڈال" والا تھا۔ چنانچہ اپنی زندگی میں مفسر یا مصنف و مؤلف کی حیثیت سے شہرت پانے کی کوئی کوشش انہوں نے نہیں کی بلکہ جو کچھ لکھا اُسے حوالہ صدوق کرتے چلے گئے۔ تاہم اُن کی جو چند مختصر چیزیں اُن کی زندگی ہی میں شائع ہوئیں، انہوں نے اُن کے تدبیر قرآن کا لوہا وقت کے چوٹی کے علماء و فضلاء سے منوالیا۔ اور اُن کی مساعی کا اصل جہل یہ برآمد ہوا کہ تدبیر قرآن کا صحیح نہج واضح ہو گیا اور قرآن حکیم کے معدنِ علم و حکمت سے معرفت کے ہیرے جواہرات نکالنے کا صحیح طریق معین ہو گیا۔

مولانا فراہیؒ پر اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان یہ ہوا کہ انہیں ایسے شاگرد بھی میسر آ گئے جنہیں انہوں نے اپنے طرز پر غور و فکر کی تربیت خود سے کرتا کر دیا تاکہ وہ اُن کے بعد ان کی روشنی ہوئی راہ پر اگلے برہم ہیں۔ اُن کے ان تلامذہ میں سب سے نمایاں مقام تو حاصل ہے مولانا امین احسن اصلاحی کو جنہوں نے نہ صرف یہ کہ حقیقتِ شرک، حقیقتِ توحید، حقیقتِ تقویٰ اور حقیقتِ نماز ایسی گرامیہ تصانیف کے ذریعے خالص قرآنی علمِ کلام کی تدوین کی راہ کھول دی (گزشتہ سے پیوستہ)۔

اس کے مندرجہ ذیل ابتدائی الفاظ قابلِ توجہ ہیں: "اس سے پہلے ہندوستان کے جن اکابر علماء کا نام کیا گیا ہے، وہ مکمل وہ تھے جن کی ولادت اور نشو و نما انقلابِ زمانہ سے پہلے ہوئی تھی، آج سب سے پہلی دفعہ ہم نئے عہد کے سب سے پہلے عالم کی وفات کے ماتم میں مصروف ہیں، ہم ایک ایسے گریجویٹ عالم کا ماتم کرتے ہیں جو اپنے علم و فضل، زہد و ورع اور اخلاق و فضائل میں قدیم تہذیب کا نمونہ تھا، لیکن جو اپنی روشن خیالی، تجدیدِ علوم و فنون کی اطلاع و واقفیت اور مقتضیاتِ زمانہ کے علم و فہم میں عہدِ حاضر کی سب سے بہتر مثال تھا۔ اس سے پہلے ان تمام علماء نے جو نئے علمِ کلام کا اپنے کو اپنی کہتے اور سمجھتے ہیں، جو کچھ کہا اور لکھا، وہ دوسروں سے سنی سنائی باتیں تھیں۔ لیکن اس جماعت میں یہ پہلی سستی تھی، جس نے فلسفہِ فعال کے متعلق لفظاً یا اثباتاً جو کچھ کہا اور لکھا وہ اپنی ذاتی تحقیق اور ذاتی علم و مطالعہ سے آج ہمارے سامنے ایسے متعدد علماء کی مثالیں ہیں جنہوں نے عربی علوم کی تکمیل کے بعد انگریزی شریع کی اور بی۔ اے اور ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈی کی سندیں حاصل کیں، لیکن اس طرح کے کچھ۔

"جو پڑھا لکھا تھا نیاز نے اسے صاف دل سے بھلا دیا۔ نئے رنگ نے پرانے رنگ کو اتنا چھپا کر دیا کہ ان پر اس کا نشان بھی نظر نہیں آتا، لیکن آج ہم جس سستی کا تذکرہ کر رہے ہیں اس کا حال یہ تھا کہ اس نئے رنگ کی شوخی سے اس کے پرانے رنگ کا گہرا پن اور بڑھ گیا تھا اور اس کو دیکھ کر یہ سمجھنا بھی مشکل تھا کہ یہ علی گڑھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی کا گریجویٹ ہے، بلکہ یہ ہے کہ اس کی ساڈی کروڑوں کروڑوں عوامِ نظامت اس کو عالمِ علم و فضل ہی طور پر سمجھتے تھے مگر وہ تھے جو اب ان کے زمانہ میں کوئی نہیں

دی (مولانا کی یہ چاروں تصانیف اب یکجا حقیقتِ دین کے نام سے مطبوعہ موجود ہیں، بلکہ خواہ عمر کے آخری حصے میں ہی، اپنے استاذ کے اصول پر باقاعدہ تفسیرِ تدریسی بھی تحریر کر دی (جواب بحمد اللہ تکمیل کو پہنچنے ہی والی ہے) اور دوسرے نمبر پر ہیں مولانا صدر الدین اصلاحی جو بھارت ہی میں مقیم ہیں۔

بے لگام اور مادرِ پدر آزاد متجددین اور روایت پرست و قدامت پسند علماء کے بینِ بینِ فکرِ قرآنی کے تین دھارے جو برصغیر پاک و ہند کے محیطِ علمی میں بہہ رہے ہیں بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے لیے جذب و انجذاب کا شدید میلان رکھتے ہیں۔

ان میں سے مؤثر الذکر دو دھارے تو درحقیقت چھوٹے ہی ایک عظیم اور گہمِ شخصیت سے ہیں جس نے دیوبند اور علی گڑھ کے ماہین ایک درمیانی راہ نکالنے کی غرض ہی سے ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ڈیرہ لگایا تھا۔ ہماری مراد علامہ شبلی نعمانی مرحوم سے ہے جنہیں مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم دونوں کے مرنے کی حیثیت حاصل ہے۔ ہم نے اب سے لگ بھگ آٹھ سال قبل ایک مفصل مضمون ان ہی صفحات میں تحریر کیا تھا جس میں علامہ شبلیؒ، مولانا فراہیؒ اور مولانا آزاد مرحوم کے ذاتی میلانات اور علمی و فکری رجحانات کا جائزہ لیا گیا تھا، جس کی تصویب مولانا عبد الماجد دریابادی نے جنہیں بلاشبہ اس قافلے کے آخری مسافر کی حیثیت حاصل ہے ان الفاظ میں کی تھی۔

..... حیرت ہوگئی، شبلی، فراہی، ابوالکلام تینوں کی یہ نباضی بعدِ زمانی اور بعدِ مکانی

دونوں کے باوجود اتنی صحیح کیوں کر کر لی! ع۔ درحیرت کہ بادہ فروش از کجا شنید!

اس تحریر کا حسبِ ذیل اقتباس طوالت کے باوصف، ان شاء اللہ، قارئینِ پرگراں گزرے گا۔

”مولانا شبلیؒ اپنی ذات میں ایک نہایت جامع الصفات انسان تھے اور ان کی شخصیتِ ندوہ کی نسبت بہت زیادہ جامع اور گہمیر تھی۔ چنانچہ وہ بیک وقت علم و فضل، فلسفہ و کلام، شعر و ادب اور قومی سیاست جتنی کر رندی اور رنگینی سب کے جامع تھے۔ اُن کے اصل جانشین

سید سلیمان ندوی مرحوم کی شخصیت میں مولانا شبلی کی ہمگیر شخصیت کے صرف چند ہی پہلوؤں کا تسلسل قائم رہ سکا۔ لیکن ان کے زیر اثر دو اور ہستیاں ایسی پروان چڑھیں جو ان کی بعض صفات کی وارث بنیں اور جن میں مولانا شبلی کی شخصیت کے بعض دوسرے پہلو اُجاگر ہوئے۔ ہماری مراد مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ سے ہے۔ یہ دونوں حضرات براہ راست توندوی نہیں لیکن ان کی تربیت میں مولانا کا بڑا حصہ ہے۔ اور چونکہ برصغیر کی حالیہ مذہبی فحور کے میدان میں علی گڑھ اور دیوبند کی دو انتہاؤں کے مابین دو اہم علمی و فکری سوتے ان ہستیوں کی بدولت بچھوٹے ہیں لہذا ان کا کسی قدر تفصیلی تذکرہ ضروری ہے۔ مولانا فراہیؒ اور مولانا آزادؒ مرحوم میں متعدد امور بطور قدر مشترک بھی ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ دونوں کی تربیت میں مولانا شبلی کا حصہ تھا۔ دوسرے یہ کہ دونوں کو قرآن حکیم سے خاص شغف تھا تیسرے یہ کہ دونوں اپنے وقت کے انتہائی وضع دار انسان تھے۔ چوتھے یہ کہ دونوں (مولانا شبلیؒ کے بالکل برعکس) جنہوں نے اپنی 'صنیت' کی شدت کے اظہار کے لیے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا متعلق جزو بنالیا تھا (مثلاً مولانا شبلیؒ کے لیے 'نعمانی' کی نسبت کو اپنے نام کا متعلق جزو بنالیا تھا) لیکن ان اشتراکات کے بعد اختلافات کا ایک وسیع میدان ہے جس میں یہ دونوں شخصیتیں ایک دوسرے کی بالکل ضد تھیں۔ مولانا آزادؒ میں شبلی کی رندی و رنگینی کا تسلسل بھی موجود رہا جب کہ مولانا فراہیؒ بالکل زاہد خشک تھے۔ مولانا آزادؒ کی وضع داری میں شکوہ و مکت کی آمیزش تھی، جبکہ مولانا فراہیؒ پر فقر و درویشی کا رنگ غالب تھا۔ مولانا آزادؒ 'ابوالکلام' تھے اور ان کی شعلہ بیان خطابت میں ایک لاوا اُگلنے والے زندہ آتش فشاں کا رنگ تھا۔ جبکہ مولانا فراہیؒ نہایت کم گو تھے اور ان کا سکوت ایک ایسے خاموش آتش فشاں سے مشابہت رکھتا تھا جس کے باطن میں تو خیالات و احساسات کا لاوا جوش مارا ہو لیکن ظاہر میں وہ بالکل ساکت و صامت ہو۔ مولانا آزادؒ کی تحریریں اصل زور عربیت اور عبارت آرائی پر تھا جبکہ مولانا فراہیؒ کی تحریر نہایت سادہ لیکن مدلل ہوتی تھی۔ مولانا آزادؒ سیاست کے میدان کے بھی شہسوار تھے اور دین کی وادی میں بھی ان کا اصل مقام داعی کا تھا جبکہ مولانا فراہیؒ سیاست سے تمام عمر کنارہ کش رہے اور دین و مذہب کے میدان میں ہی ان کا اصل مقام آخر دم تک صرف ایک طالب علم یا زیادہ سے زیادہ ایک محکمہ کارہا۔ چنانچہ مولانا آزادؒ طوطی مہند تو تھے ہی، ایک وقت ایسا بھی گزرا جب وہ امام الہند قرار پائے جبکہ مولانا فراہیؒ سے ان کی زندگی میں بھی اور آج تک کچھ علم و دست لوگ ہی واقف ہو سکے۔ لیکن اس کے برعکس مولانا آزادؒ تو آندھی کی مانند اُٹھے اور گجرات کی طرح رخصت ہو گئے تا آنکہ آج وہ لوگ بھی ان کا نام لینا تک گوارا نہیں کرتے جنہوں نے اپنی قبیل خود ان ہی کی شمع سے روشن کی جبکہ مولانا فراہیؒ ایک مستقل طرز فکور، اور

مکتب علمی کی بنیاد رکھ گئے جن کا نام ابو ایک ادارہ ”دارالاحمد حمیدیتہ“ کے نام سے ہندستان میں اور ایک انجمن ”انارنا امین احسن اصلاحی کی ذات میں پاکستان میں موجود ہے۔

قرآن مجید سے جو شغف ان دونوں بزرگوں کو تھا، مزاج کے افتاد کے فرق کی بنا پر اس کا ظہور بھی مختلف صورتوں میں ہوا۔ مولانا آزاد کی تفسیر سورہ فاتحہ اردو ادب کا توشا ہمارا (CLASSIC) ہے ہی، قرآن کے جلال و جمال کا بھی ایک حسین مرقع ہے۔ پھر سورہ کہف کے بعض مباحث میں ان کی تحقیق و تدقیق کا تو کوئی جواب ہی نہیں۔ بایں ہر قرآن حکیم کا کوئی مرتب و منضبط فکر وہ پیش نہیں کر سکے جبکہ مولانا فراہیؒ نے قرآن حکیم کے استدلالی پہلو کو واضح کیا اور ایک طرف نظم قرآن کی اہمیت واضح کر کے تدبر قرآن کی نئی راہیں کھولیں اور قرآن پر غور و فکر کے اصول و قواعد از سر نو مرتب و تدوین کیے اور دوسری طرف اپنی بعض تصنیفات میں (جو تاحال مسودات ہی کی صورت میں ہیں) خالصہ قرآن حکیم کی روشنی میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد رکھ دی۔

قصہ مختصر — علامہ شبلی نعمانیؒ، امام حمید الدین فراہیؒ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ

کے ہیں اور اب دیکھنا سبک کا یہی رشتہ تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے معنوی خلیفہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے ”قیام حکومت الہیہ“ کے نصب العین کے پیش نظر ’جماعت اسلامی‘ کی تائیس کی توان کی دعوت پر نہ صرف یہ کہ مولانا فراہیؒ کے تمام نمایاں شاگرد بشمول مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا اختر احسن اصلاحی، اور مولانا صدر الدین اصلاحی لیکر کہتے ہوئے حاضر ہو گئے بلکہ مولانا شبلیؒ کے تلمیذ رشید مولانا سید سلیمان ندویؒ کے دواشاد تلامذہ یعنی مولانا ابوالحسن علی ندوی اور مولانا مسعود عالم ندویؒ بھی — ”من نیز حاضر می شوم۔۔۔“ کے مصداق بن گئے۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اس ’قرآن السعدین‘ سے بہت سی برکتیں ظہور میں آئیں جن کا نمایاں ترین مظہر مولانا امین احسن اصلاحی کی شاہکار تالیف ’دعوت دین اور اس کا طریق کار‘ ہے جس میں ایک جانب مولانا فراہیؒ کے قرآنی غور و فکر کا تعمق موجود ہے تو دوسری جانب مولانا آزادؒ مرحوم کا داعیاء جوش و خروش بھی موجود ہے۔ اور اسی کے ذیل میں آتی ہیں مولانا صدر الدین اصلاحی کی بعض تصانیف جیسے ’فریضہ اقامت دین‘ — ’حقیقت نفاق‘ — اور — ’اساس دین کی تعمیر وغیرہ۔‘

رہا، فکر قرآنی، کا اول الذکر دھارا جس میں علامہ اقبال مرحوم کو تنہا ایک انجمن کی حیثیت حاصل ہے تو اس کا بھتیہ دونوں دھاروں سے ربط و تعلق اس واقعے سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا مودودی کو حیدر آباد کن کی بنجر اور سنگلاخ زمین سے ہجرت کر کے پنجاب ایسے زرخیز اور سرسبز و آباد خطے میں اقامت گزیر ہونے کی دعوت علامہ اقبال مرحوم ہی نے دی تھی۔ اور اس سے بھی آگے یہ کہ معروف علماء کے حلقے میں علامہ مرحوم کے سب سے بڑے بلکہ غالباً صحیح تر الفاظ میں ولید شہدائی مولانا ابوالحسن علی ندوی ہی ہیں۔

مزید برآں، پنجاب میں مولانا مودودی کو جو مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کی دعوت اور عہد دونوں کو جو فروغ نصیب ہوا، بعض دوسرے اسباب و عوامل کے ساتھ ساتھ اس کا اہم ترین سبب یہی ہے کہ یہاں علامہ اقبال مرحوم اپنے اشعار کے ذریعے گویا قلوب کی دنیا میں ہل چلا چکے تھے اور زمین و آسمان کے مابین ایک وسیلہ بن چکے تھے اور یہ اپنے خزانے اگل کر رکھ دے، خصوصاً پنجاب کا جدید تعلیم یافتہ نوجوان تو گویا اس ”دگر دانائے راز“ کے لیے چشم براہ تھا جس کا ذکر بشدیہ حیرت یاس علامہ مرحوم نے مرتے دم کیا تھا!

© rasailojaraid

باب چہارم

مرکزى انجمن خدام القرآن لاھور

موسس

© rasailojaraid.c

© rasailojaraid.c